اُردو افسانہ اور جرم کے سطحی تصورات

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

People's understanding of what constitutes anti-social behavior is determined by a series of factors including context, location, community tolerance and quality of life expectations. As a result, what may be considered anti-social behavior to one person can be seen as acceptable behavior to another. The subjective nature of the concept makes it difficult to identify a single definition of anti-social behavior. To overcome this issue, an approach to defining and analyzing anti-social behavior is set out through Urdu short story. The Urdu short story writers accepted truth regarding anti-social behavior is that spiritual, religious and social guidance carries an undoubtedly strong influence.

> ''ہم چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں مگر اسے کوئی اور نام نہیں دیتے۔ یہ معزز ہستیاں بدترین قسم کی ڈاکہ زنی کرتی ہیں مگر یہ معزز سمجھی جاتی ہیں۔ ....وزیر صاحبان اپنی مسندِ وزارت کی سان پر استرا تیز کر کے ملک کی ہر روز حجامت کرتے ہیں، یہ کوئی جرم نہیں۔ لیکن کسی جیب سے بڑی صفائی کے ساتھ بٹوا چرانے والا قابلِ تعزیر ہے ....اور بھی کئی مقتل ہیں جہاں انصاف، انسانیت، شرافت ونجابت، تقدس وطہارت، دین ودنیا سب کو ایک ہی پھندے میں ڈال کر ہر روز پھانسی دی جاتی ہے ....ان کے نام دس نمبر کے بستہ الف میں درج ہیں نہ بستہ ب میں .... یہ کس قدر ناانصافی ہے۔'' [۱]

اُردو افسانے نے ''جھوٹی کہانی''، ''ممد بھائی''، ''ساڑھے تین آنے'' وغیرہ کی صورت میں جرائم کی دُنیا سے وابستہ افراد کے بارے میں سامنے آنے والے نفسیاتی، سماجی تعزیراتی اور معاشرتی تصورات کی سطحیت سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اُردو افسانے نے سماج مخالف سمجھے جانے والے کرداروں کی گہرائی میں اُتر کر معاشرتی نظام کے اس ڈھانچے کا سراغ لگایا جو جرائم کی دُنیا کو جنم دیتا ہے اُردو افسانے نے جرائم میں گھرے ہوئے کرداروں کے باطن سے فطری انسان کو باہر نکالا اور اس پر غیر متوازن سماجی رویوں کے اثرات کا جائزہ لیا۔

اُردو افسانے نے سماج مخالف شخصیت کا انوکھا اور نازک تصور ''قیمے کی بجائے بوٹیاں''، ''سڑک کے کنارے''، ''کھول دو''، ''شریفن''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''سرکنڈوں کے پیچھے'' (منٹو)، ''انتقام'' (خواجہ احمد عباس)، ''شکر گزار آنکھیں''

(حیات اللہ انصاری)، ''یاخدا'' (قدرت اللہ شہاب)، ''جانور''، ''دوسری موت'' (کرشن چندر)، ''اندھیرا اور اندھیرا'' (شوکت صدیقی)، ''چوپال'' (احمد ندیم قاسمی)، ''شہر آشوب''، ''منی'' (اقبال متین)، ''نصیب جلی''، ''زہر تھوڑا سا'' (رام لعل)، ''پناہ گاہ'' (جوگندر پال)، ''درشن کب دو گے'' (جیلانی بانو)، ''نہ مرنے والا'' (انور سجاد)، ''منی'' (خالد حسین) وغیرہ جیسے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انفرادی سطح پر (قیمے کی بجائے بوٹیاں) سے لے کر اجتماعی سطح تک ہر مرحلے کا جائزہ اُردو افسانے میں سماج مخالف شخصیت کے حوالے سے ملتا ہے۔

منٹو کا افسانہ'' ساڑھے تین آنے'' اس حوالے سے اردو کا نمائندہ افسانہ ہے جو ان کے معتوب افسانوی مجموعے ''ٹھنڈا گوشت'' میں شامل ہے۔ منٹو کا یہ مجموعہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ منٹو کا یہ افسانہ جرائم اور تعزیرات کے سطحی تصورات کا خاکہ اڑاتا ہوا نظر آتا ہے اور بہ ظاہر مجرم تصور ہونے والے فرد کے حالات وواقعات کی گہرائی میں جا کر ان عواقب وعواطف کا جائزہ لیتا ہے جو انسان کو جرم کی جانب پیش قدمی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ منٹو لکھتا ہے۔ ''میں نفسیات کا ماہر نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا، حالات سے ہوتا ہے'' [۲] منٹو نے افسانے میں پھگو بھنگی کا کردار پیش کیا ہے جسے ساڑھے تین آنے چوری کرنے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہو جاتی ہے۔ منٹو نے اسی سزا پر اپنا ردِعمل اس افسانے میں ظاہر کیا ہے اور اس بات پر بھی استدلال کیا ہے کہ سزاؤں اور جیلوں سے جرائم کا خاتمہ ممکن نہیں۔ جرائم کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ ان سماجی حالات کی اصلاح کی جائے جو افراد کو سماج مخالف رویوں پر اُکساتے ہیں۔ اسی طور ان کے ایک اور لازوال افسانہ ''جھوٹی کہانی'' جیلوں میں بند مجرموں کے حالِ دل کو سناتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں شائع ہونے والے منٹو کے مجموعے ''یزید'' میں یہ افسانہ شامل ہے۔ انوکھے موضوع اور کاٹ دار لہجے کے اعتبار سے یہ خالصتاً منٹو کا افسانہ ہے۔ منٹو نے افسانے میں چور، ڈکیت، رہزن، جیب تراش، جعل ساز، پتے باز اور بلیک مارکیٹ کرنے والے منفی کرداروں کو یوں پیش کیا ہے کہ ان لوگوں سے نفرت کرنے کی بجائے قاری کی نفرت کا رُخ ان معززین کی طرف ہو جاتا ہے جو وزارتوں، عہدوں اور وسیع اختیارات کی آڑ میں گھناؤنے جرم کرتے ہیں۔ منٹو کے خیال میں سماجی زندگی اور معاشرتی طرزِ احساس کو سب سے زیادہ نقصان انہی معزز مجرموں سے پہنچا ہے۔ افسانہ نگار کے خیال میں ''ان کے نام دس نمبر کے بستہ الف میں درج ہیں نہ بستہ ب میں۔۔۔ یہ کس قدر ناانصافی ہے۔'' [۳]

بمبئی کی فلمی دُنیا سے ہٹ کر گلی کوچوں میں رہنے والوں کی زندگی کا عکاس منٹو کا افسانہ ''ممد بھائی'' ان کے افسانوی مجموعے ''سرکنڈوں کے پیچھے'' کے بعد منٹو کے افسانوی کلیات ''منٹو نامہ'' میں شائع ہوا۔ منٹو نے اس افسانے میں بمبئی کے اول درجے کے چھری مار، پھکیت، گٹکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا ممد بھائی کی ہیبت ناک مونچھوں میں چھپے ہوئے دردمند دل رکھنے والے انسان کو ٹٹولا ہے۔ منٹو نے ممد بھائی کے ظاہری عوامل کی بجائے اس کے باطن میں موجود خلوص، محبت اور معصومیت کو افسانے میں اُجاگر کیا ہے۔ تعزیراتِ ہند کے ساتھ ساتھ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہل کاروں اور دوسرے لوگوں کے نزدیک ممد بھائی سماج کے لیے ازحد خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر منٹو نے ان تمام تصورات کو رَد کرتے ہوئے کہا: ''خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں۔'' [۴] افسانے کا انجام انہی مونچھوں کی صفائی پر ہوتا ہے۔ ممد بھائی بمبئی کی فضاؤں میں بسنے والا چھٹا ہوا

بدمعاش سہی مگر عیاش اور رندِ بلانوش نہیں۔ اس کی بدمعاشی کے خول میں ایک ہمدرد اور پُرخلوص ممد بھائی کو منٹو کی نگاہوں نے تلاش کیا۔ایک ایسا کردار جس سے اطراف کے لوگوں کی مفلوک الحالی نہیں دیکھی جاتی۔اس کے علاقے کے مفلس و نادار، بیمار، بوڑھے اور لاچار لوگ مدد کے لمحے میں ممد بھائی کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔ اس طرز کے کرداروں کے بارے میں ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> ''منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری۔منٹو کا انسان آدمِ خاکی ہے۔ وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کا امکان ہونے کے باوجود جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔''[۵]

منٹو کے مذکورہ تینوں افسانے ''ساڑھے تین آنے''، ''جھوٹی کہانی'' اور ''ممد بھائی'' سماج دشمن عناصر کے سطحی تصورات کے خلاف ردِعمل کی صورت بن جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں سماج مخالف شخصیت کے مذکورہ بالا تصورات نفسیاتی اور سماجی نظریات کی کسی بھی صورت تائید کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اُردو افسانہ نگاروں نے سماجی تغیرات کا جائزہ لیتے ہوئے جرائم کے لیبل یافتہ افراد کو نہیں بلکہ ان معززین کو سماج مخالف شخصیت قرار دیا ہے کہ جو اپنے اختیارات کی مدد سے سماجی زندگی کو دھچکا پہنچا رہے ہیں اور ہر طرح کی گرفت سے آزاد بھی ہیں۔

منٹو کا افسانہ'' قیمے کی بجائے بوٹیاں'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے ''بغیر اجازت'' میں شائع ہوا۔منٹو کے اس افسانے سے ان کے سماج مخالف شخصیت کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔ افسانے میں ڈاکٹر سعید کا کردار مرکزیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سعید بہ ظاہر سلیقہ شعار اور سماج کے اونچے درجے پر فائز نظر آتا ہے مگر منٹو نے اس کے باطن سے گھناؤنی شخصیت کے رُخ کو بے نقاب کیا ہے۔منٹو کی نگاہ ڈاکٹر سعید کے باطن میں تہذیب، سماجی مرتبے اور اخلاق کے پردوں میں چھپے ہوئے خونی درندے تک پہنچی ہے جو شک و شبہ کی وجہ سے اپنی بیوی کو قتل کر کے اس کے اعضاء کو بوٹیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ بوٹیاں ایک دیگ میں بھنوائی جاتی ہیں مگر ڈاکٹر سعید کی درندہ صفتی اس حد کو چھو لینے کے باوجود تشنہ دکھائی دیتی ہے اور اسے قیمہ نہ بنا سکنے پر ازحد ندامت محسوس ہوتی ہے۔

منٹو کے مذکورہ افسانے میں ڈاکٹر سعید کا کردار ممد بھائی کے کردار سے ازحد مختلف ہے۔ ممد بھائی اور ''جھوٹی کہانی'' کے غنڈے سب کچھ ہوتے بھی انسانیت کے شرف و وقار کو سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں جب کہ شرف و وقار میں چھپا ہوا ڈاکٹر سعید خونی درندہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سعید کو بوٹیاں بنوا لینے کے بعد بھی اپنے بیہمانہ فعل پر ندامت یا تشویش نہیں ہوتی بلکہ وہ اس پر اطمینان محسوس کرتا ہے۔ مجید امجد نے منٹو کو پہچانا اور اسیا یک ایسا فن کار قرار دیا جو بغیر پوچھے ہمیں مہذب دنیا کی روحوں کے عفریت کدوں میں لے جاتا ہے اور ضمیر کے پر پیچ دھندلکے دکھلاتا ہے۔'' قیمے کی بجائے بوٹیاں'' میں منٹو نے یہی کام کیا ہے اور اسی افسانے سے منٹو کا سماج مخالف شخصیت کا تصور بھی واضح ہوتا ہے۔کرداروں کی شقاوت اور بے رحم فطرت کا دوسرا منظر منٹو نے ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں بیان کیا۔

نفسیاتی اعتبار سے جب قوموں میں جبلتِ مرگ زور پکڑتی ہے تو قومیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ انسان کا یہ جنون کبھی عالمی جنگوں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو کبھی فسادات کی شکل میں۔ دُنیا میں ہر نوع کے انفرادی اور

اجتماعی نوعیّتوں کے فسادات سیاسی فیصلوں اور چال بازیوں کے سبب جنم لیتے ہیں اور جنہیں بعد میں اجتماعی نفسیاتی حالت مزید ہوا دیتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں انسان نے جس طرح انسانیت کے شرف و وقار اور امن پسندی کی دھجیاں اُڑایں، ان کے نفسیاتی محرکات بعد بہت میں پیدا ہوئے مگر اس جنون کا آغاز سیاسی فیصلوں سے ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ نفسیاتی سطح پر ''ساڑھے تیرہ سو برسوں کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ'' [۶] چکانے کے عوامل اپنی جگہ مضبوط حوالہ بنتے ہیں مگر اس جنون کا آغاز کیسے ہوا یہ مسئلہ نفسیاتی پس منظر سے زیادہ سیاسی پس منظر رکھتا ہے۔ تقسیم کے مجوزہ فیصلوں سے اختلاف کرنے والے گاندھی اور نہرو کیسے ماونٹ بیٹن سے آخر میں جا کر متفق ہو گئے اور مولانا عبدالکلام آزاد کو اس موقع پر گاندھی اور نہرو کے رویوں سے کیسے صدمہ پہنچا ان تمام عوامل کی تفصیل ''انڈیا ونس فریڈم'' اور سیروائی کی کتاب ''تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت'' سے بھی مل جاتی ہے۔ گاندھی کا یہ جملہ بھی از حد اہم ہے: ''اگر غسلِ خوں ضروری ہے تو عدم تشدد کے باوجود کرایا جائے گا'' [۷] برصغیر میں رہنے والوں کے باہمی جذب و میل اور فسادات کے پھوٹ پڑنے پر خون کے آنسو رونے والوں کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں موجود ہے۔ یہاں کے لوگ قتل و غارت نہیں چاہتے تھے، آبروریزی کرنا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا مگر سیاسی آمروں نے بالآخر ان لوگوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ جہاں قتل و غارت گری کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ بچا ہی نہ تھا (شریفن از منٹو)۔ فسادات کے حوالے سے منٹو کا یہ جائزہ درست معلوم ہوتا ہے:

> ''اصل میں یہ لوگ، یہ چند افراد ایک حادثے کی پیداوار ہیں۔ یہ قتل وخون کے عادی نہیں تھے، مگر حالات نے انہیں ایسا بنا دیا۔ وہ اپنی ماؤں سے پیار کرتے تھے، دوستوں سے محبت کرتے تھے، ان کو اپنی بہو بیٹیوں کی عزت و ناموس کا پاس تھا۔ ان کو خدا کا خوف بھی تھا مگر یہ سب کچھ ایک حادثے نے اڑا دیا۔'' [۸]

اُردو افسانے نے جہاں گلے پر دھیرے دھیرے چھری پھیرنے سے لطف محسوس کرنے والے کرداروں کو پیش کیا تو وہاں کشت وخوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کے اندر انسانیت کی آخری رمق کو بھی تلاش کیا ہے۔ فسادات کے حوالے سے لکھے جانے والے افسانوں میں ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جو وحشت اور بربریت کی فضاؤں میں رہ کر بھی اپنے باطن میں موجود تصورِ خیر کو نہ اکھاڑ سکے۔ خواجہ احمد عباس کے افسانے ''انتقام'' اور منٹو کے ''شریفین'' دونوں ہی میں اپنی اپنی بیٹی کی آبروریزی اور قتل کا منظر دیکھ کر غیظ و غضب کی علامت بنتے ہوئے کردار سڑک پر گرم لاوے کی مانند بہنے لگتے ہیں تو دونوں ہی کا جذبۂ انتقام ہندو لڑکی کی لاش کو دیکھ کر سرد ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے ''شریفین'' کے باپ قاسم کے جذبے کو ''جنس زدہ مردوں میں شفقت پدری'' [۹] کے ظہور کے حوالے سے دیکھا۔ کم و بیش یہی صورتِ حال خواجہ احمد عباس کے ''انتقام'' میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے فسادات کے منظر سے ایسے کرداروں کو تلاش کیا جو حیوانیت کی اس وبا کے پھیلنے کے باوجود اپنے اندر کے انسان کو اس وبا کی لپیٹ میں نہ لا سکے۔ منٹو لکھتا ہے:

> ''میں نے خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرقِ انفعال کے، مشقت کے جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی۔ ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں نہ ختم کر سکے۔'' [۱۰]

''شریفین'' کے حوالے سے ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> ''شریفین کا قاسم بملا کی عریاں لاش دیکھ کر اس کا منہ ڈھانپ دیتا ہے۔ اسے اس میں اپنی بیٹی کا روپ نظر آتا ہے یعنی اس میں اتنی انسانی حس باقی ہے کہ کسی بھی لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر اس پر یہ کیفیت طاری ہو سکے۔''[۱۱]

خواجہ احمد عباس کے ''انتقام'' میں باپ اپنی بیٹی کی لاش اور اس کی کٹی ہوئی چھاتیاں دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور جب ہوش میں آتا ہے تو کسی ہندو لڑکی کو قتل کر کے اس کی بھی چھاتیاں کاٹنے کا عہد لیے ہوئے گلی میں نکل آتا ہے مگر اسے سب سے پہلے جس ہندو لڑکی سے واسطہ پڑتا ہے اس کی چھاتیاں پہلے ہی سے کٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس موقعہ پر اسے اپنی بیٹی یاد آجاتی ہے اور وہ بھی قاسم کی مانند اس برہنہ زخمی لڑکی کو چادر سے ڈھانپ دیتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے اس افسانے کو قدرے نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کا یہ افسانہ فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل، منٹو کے ''شریفین'' کی موجودگی کے سبب اُردو تنقید و تحقیق کی نظر اس افسانے پر کم ہی پڑی ہے۔ اپنی دردمندی، انتقام اور بچی کھچی انسانیت کی موجودگی کے حوالے سے یہ افسانہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے کا اختتام کردار کی اس کش مکش پر ہوتا ہے کہ جب ہندو اور مسلمان دونوں ہی کی بہو بیٹیاں چھاتیوں کے بغیر لاشیں بنتی جا رہی ہیں تو میں کون ہوں؟ ہندو یا مسلمان۔ اسی سوالیہ نشان پر افسانہ ختم ہوتا ہے۔ اس طرز کے افسانے اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان سماج مخالف رویوں پر خود سے مائل نہیں ہوتا بلکہ حالات کا دھارا اسے مجبور کرتا ہے۔

خواجہ احمد عباس اور منٹو دونوں ہی کے مذکورہ افسانے سماج مخالف فتوری شخصیت کے نفسیاتی نہیں بلکہ ادبی اور سماجی تصورات کو ظاہر کرتے ہیں۔ تخلیق کاروں نے جس طرح فسادات کے حالات و واقعات میں گھرے ہوئے انسانوں کے باطن سے خیر کے پہلو کو اُجاگر کیا وہ نفسیات کی دسترس میں لانا ناممکن سا محسوس ہوتا ہے۔ منٹو ہی کا ایک اور افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' بھی اسی سیاق و سباق میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ منٹو نے پاکستان آنے کے بعد لکھا۔

کرشن چندر نے انفرادی سطح پر کردار نگاری کی بجائے اجتماعی سطح پر فسادات سے پھوٹنے والے جنوں کو ''پشاور ایکسپریس''، ''جانور'' اور ''ہم وحشی ہیں'' میں شامل تمام افسانوں میں اپنا موضوع بنایا۔ انتظار حسین کو کرشن چندر کے یہ افسانے خواہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ادبی بلیٹن محسوس ہوں خواہ ممتاز شیریں کو ترازو میں ناانصافی نظر آئے، حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کے تمام افسانوں کا ماخذ کرشن چندر کا اپنا ہی گھر ٹھہرتا ہے کہ جہاں لٹے پٹے ہوئے مہاجرین نے عارضی پناہ لے رکھی تھی [۱۲]۔ کرشن چندر ان مہاجرین کی حالت زار کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ مشاہدہ اور متخیلہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے مسلمانوں کے ہاتھوں لٹے ہوئے اور برباد حال ہونے والے ہندوؤں اور سکھوں کو دیکھا تھا مگر ہندوؤں کے عتاب کا نشانہ بن کر جانے والے مسلمانوں کے احوال سے وہ صرف معلوماتی سطح پر واقف تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں میں ترازو کا عدم توازن ایک فطری ردِعمل تھا۔ اس پر زیادہ شور مچانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں، ترازو کے توازن اور عدم توازن کا حوالہ دینا بذاتِ خود مظلوم اور کچلے ہوئے لوگوں کی روحوں پر ایک بڑا داغ بنتا ہوا کم از کم ہمیں تو محسوس ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے جب بیدی بھی یہ لکھتے ہیں:

''فسادات کے بارے میں جب بڑے سے بڑے ادیب اپنی کہانیوں میں برابر کی تقسیم کے ساتھ قتل کرتے ہیں تو کتنے self conscious اور بے ایمان معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دہلی یا جموں کے قتل عام میں صرف مسلمانوں کو قتل ہوتا دکھا سکیں اور شیخوپورہ کے قتل عام میں صرف ہندوؤں اور سکھوں کو۔'' ۱۳

اشک کے نام بیدی کے خط سے لیے جانے والے مندرجہ بالا چند جملوں میں اگرچہ بیدی نے کرشن چندر کا نام نہیں لیا مگر ''بڑے سے بڑے ادیب'' کا حوالہ کرشن چندر ہی سے جڑتا ہے۔ کرشن چندر کے ہاں ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں مذاہب سے تعلق رکھنے والے ایسے کردار نظر آتے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں قتل و غارت گری میں حصہ بھی لیا اور اس کا شکار بھی ہوئے۔ اس موضوع کے حوالے سے کرشن چندر کے ہاں انفرادی سطح کا کوئی بھرپور کردار نہیں ملتا۔ انہوں نے اجتماعی رنگ میں فسادات میں شریک لوگوں کو دیکھا ہے اور اس میں انہوں نے مذاہب اور خطوں کی تخصیص نہیں کی۔ وقار عظیم لکھتے ہیں کہ ان کے اکثر دوست انہیں طعنہ دیتے تھے: ''پچھلے جنم میں تو ضرور مسلمان رہا ہوگا'' ۱۴ خواجہ احمد عباس نے مسلمانوں کیساتھ ڈھائے جانے والے مظالم کے حوالے سے کہا ''جتنی کہانیاں اس (کرشن چندر) نے فسادات پر لکھی ہیں ان میں مسلمانوں اور اسلام سے خاص دل چسپی لگتی تھی، بلکہ طرف داری۔'' ۱۵ خواجہ احمد عباس، انتظار حسین اور ممتاز شیریں وغیرہ کے مذکورہ بیانات سے تنقید کا المیہ نمایاں ہوتا ہے کہ تنقید نے اعداد و شمار اور ترازو کے جس پلڑے سے بیزاری کا اظہار کیا وہ اظہار خود انہی پلڑوں میں رکھ کر کیا گیا۔ اس حوالے سے منٹو کی یہ سطر ناقدین اور کچھ افسانہ نگاروں کا منہ چڑاتی نظر آتی ہے: ''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں، یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔'' ۱۶

اُردو افسانہ نگاروں نے فسادات میں رونما ہونے والی انسانی وحشت اور جنون میں لپٹے ہوئے انسانوں میں زندہ رہ جانے والی انسانیت کا جہاں سراغ لگایا تو وہاں ان شقی القلب اور بے رحم کرداروں کو بھی پیش کیا کہ جن کے نزدیک نہر کنارے فرداً فرداً قتل کرنے سے بہتر ہے کہ سبھی کو بھٹے کی انگیٹھی میں ڈال کر آگ لگا دی جائے (جانور از کرشن چندر)۔ اس عہد کی مجموعی صورتِ حال کو رشید جہاں نے ایک وبا قرار دیا۔ وہ لکھتی ہیں: ''میں ہندو مسلمان فساد کو ایک بیماری خیال کرتی ہوں۔۔۔ جس طرح ملیریا کی دوا معلوم ہوگئی۔ آخر اس کا بھی کوئی نہ کوئی علاج ہوگا۔'' ۱۷ منٹو نے بھی فسادات سے پیدا ہونے والے حالات کے علاج پر زور دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس (فسادات) کے نتائج پر غور کریں، ان باریکیوں کا مطالعہ کریں جو پیدا ہو چکی ہیں اور یہ کام مصنفین کا نہیں، عدالتوں کا نہیں، نفسیات کے ماہروں کا ہے جو معاملے کی تہہ تک پہنچیں اور اس کا کوئی علاج تجویز کریں۔'' ۱۸

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اُردو افسانے نے منٹو ہی کی صورت میں فسادات کے جنوں کے علاج کا راستہ سمجھایا۔ بظاہر منٹو اور روحانیت بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض مقامات پر محسوس ہوا ہے کہ منٹو نے وحشت، بربریت اور قتل و خون کے رویوں کا حل روحانیت ہی میں تلاش کیا ہے۔ اس حوالے سے منٹو کی ان سطور کو جھٹلانا آسان نہیں رہتا:

''میں سمجھتا ہوں کہ بدکرداروں، قاتلوں اور سفاکوں کی نجات کا راستہ صرف روحانی تعلیم ہے۔ ملائی طریق

پر نہیں، ملائی پسند اُصولوں پر۔۔۔ان کو یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ خدا نے انسان ہی کو افضل ترین مقام بخشا ہے۔اس کو نبیوں کا خاتم بنایا ہے۔انسان کا جو مرتبہ ہے اگر اس کے ذہن نشین ہو جائے گا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی لغزشوں سے یقیناً آگاہ ہو جائیں گے اور اس روحانی غسل سے شفایاب ہوں گے۔''[۱۹]

نظریاتی سطح پر منٹو کی مندرجہ بالا سطریں اور ژنگ کی کتاب "Psychology and Religion" میں موجود مباحث انسان کے صحت مند طرزِ حیات کے لیے مذاہب اور روحانیت کی اہمیت اُجاگر کرتے ہیں۔منٹو نے بڑی سنجیدگی سفاکوں، قاتلوں وغیرہ کی تربیت اور نشوونما میں مذہبی اور روحانی اقدار کی کمی کو بھی پرکھا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُردو افسانہ نگاروں نے سماج مخالف شخصیت کے نفسیاتی، سیاسی، سماجی تصورات کو سطحی قرار دے کر ان خیالات کو رَد کیا۔اُردو افسانہ نگاروں نے سماجی حالات و واقعات کو سفاکی، بے رحمی وغیرہ کی محرک قوت کے طور پر محسوس کیا۔علاوہ ازیں، اُردو افسانہ نگاروں نے بہ ظاہر مضر دکھائی دینے والے انسانوں کے باطن سے فطری انسان کو تلاش کیا۔ خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''انتقام''، منٹو کے ''شریفین''، ''ٹھنڈا گوشت'' وغیرہ اسی طرز کے نمائندہ افسانے ہیں۔اُردو افسانے نے ان معزز ہستیوں کی طرف بھی اشارہ کیا جو معاشرہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں (جھوٹی کہانی، ساڑھے تین آنے از منٹو)۔افسانے میں ایسے کرداروں کی نشان دہی بھی کی گئی جو تہذیب، سماجی رتبے وغیرہ کے پردوں میں خونی درندے کو چھپائے پھرتے ہیں مگر انہیں کوئی معتوب نہیں سمجھتا (قیمے کی بجائے بوٹیاں، سرکنڈوں کے پیچھے از منٹو)۔فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں سے سماج مخالف شخصیت کا اجتماعی جنون سامنے آتا ہے۔خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، قاضی عبدالستار، رام لعل، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، انور سجاد، خالدہ حسین، جمیلہ ہاشمی وغیرہ نے اپنے افسانوں میں فسادات کے حوالے سے سماج مخالف فتوری جذبوں اور ان کے حامل کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں ان کی وحشت، جنون، سفاکی وغیرہ کو نمایاں تو کیا وہاں ساتھ میں کچھ ایسے کردار بھی سامنے لائے جو اس اجتماعی جنونی فضا میں رہتے ہوئے بھی انسانیت کے درجے پر قائم رہے۔

حواشی:

۱۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو نامہ'' (افسانوی کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۶

۲۔ ایضاً، ص: ۴۳

۳۔ ایضاً، ص: ۴۲

۴۔ ایضاً، ص: ۵۹۷

۵۔ ممتاز شیریں: ''منٹو نہ نوری، نہ ناری'' (مرتبہ آصف فرخی)، کراچی: مکتبہ اُسلوب، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۰

۶۔ شہاب، قدرت اللہ: ''یا خدا''، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۴۸ء، ص: ۲۵

۷۔ سیروائی، ایم۔ایچ: ''تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت''، س۔ن، ص: ۱۳ (بحوالہ)

۸۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو راما'' (افسانوی کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۰۳

۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ۔ تحقیق و تنقید''، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۸ء ص: ۲۳۵
۱۰۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو نامہ''، ص: ۲۲۲
۱۱۔ ممتاز شیریں: ''منٹو نہ نوری، نہ ناری''، ص: ۱۳۴
۱۲۔ ودھاون، جگدیش چندر: ''کرشن چندر۔ شخصیت اور فن''، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۹
۱۳۔ بیدی، راجندر سنگھ: ''مکتوب (اوپندر ناتھ اشک کے نام)''، ''جریدہ''، (بیدی نمبر)، ص: ۶۰۱
۱۴۔ وقار عظیم، پروفیسر: ''نیا افسانہ'' علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، س۔ن، ص: ۲۱۲
۱۵۔ احمد عباس، خواجہ: ماہنامہ ''بیسویں صدی'' (کرشن چندر نمبر)، دہلی، ص: ۴۲
۱۶۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو راما''، ص: ۲۰
۱۷۔ رشید جہاں، ڈاکٹر: ''شعلۂ جوالا''، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۶۸ء، ص: ۴۴
۱۸۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو راما''، ص: ۳۰۳
۱۹۔ ایضاً، ص: ۳۰۵